واصف علی واصف *

اقبال اور خودی

پیر رومی کی قیادت میں عشقِ مصطفیٰؐ کی عظیم دولت سے مالا مال ہو کر اقبال جب عرفانِ ذات کے سفر پر روانہ ہوا تو اُس پر وسیع و جمیل کائنات کے راز کچھ اس طرح منکشف ہونا شروع ہوئے، جیسے عجائبات کا دبستاں کھل گیا ہو۔ اُس کا ذوقِ جمال اُسے سُرور و وجدان کی منزلیں طے کراتا ہوا بارگاہِ حُسنِ مطلق تک لے آیا۔ کائنات اُسے مرقعِ جمال نظر آئی۔ اُس نے دیکھا، غور سے دیکھا اور دیکھ کر محسوس کیا کہ موتی، قطرہ، شبنم، آنسو، ستارے سب ایک ہی جلوے کے رُوپ ہیں۔ اُسے قطرہ، دریا، بادل، جھیلیں، سمندر ایک ہی وحدت میں نظر آئے۔ اُسے ذرّے میں صحرا اور قطرے میں دریا نظر آیا۔ اُس نے فرد اور معاشرے کی وحدت دیکھی، بھیڑ میں تنہائی دیکھی اور تنہائی میں ہجوم نظر آیا۔

اقبال کو یہ کائنات ایک عظیم دھڑکتے ہوئے دل کی طرح محسوس ہوئی۔ اُس کے اپنے دل کی دھڑکن، کائنات کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو گئی۔ اُس نے جلوۂ جاناں کو ہر رنگ میں آشکار دیکھا۔ اقبال کو عشق نے اُس مقام تک پہنچا دیا، جہاں انسان کو غیر از جمالِ یار کچھ نظر نہیں آتا۔ اُس مقام پر انسان کہہ اٹھتا ہے:

اب نہ کہیں نگاہ ہے، اب نہ کوئی نگاہ میں
محو کھڑا ہوا ہوں میں حُسن کی جلوہ گاہ میں[1]

اس منزلِ دیدارِ حُسن پر پہنچ کر انسان یہ بیان نہیں کر سکتا کہ یہ کیا مقام ہے؟ صاحبِ منزل خود آئینہ ہوتا ہے، خود رُو برو، خود نظر اور خود ہی محوِ نظارہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ لیکن اقبال اس مقام پر ٹھہرا نہیں۔ اُس نے جلوۂ

حُسنِ کائنات سے معنیِ کائنات کی طرف قدم بڑھایا۔اُسے حُسنِ فطرت نے ایک عظیم پیام عطا کیا۔اقبال نے غور کیا کہ یہ کائنات کیا ہے،انسان کیا ہے،حُسن کیا ہے،عشق کیا ہے،زندگی کیا ہے،موت کیا ہے،مابعدموت کیا ہے،عمل کا مفہوم کیا ہے،عقل کیا چیز ہے،حیرت کیا ہے اور جلوہ کیا ہے،رموز کیا ہیں،ظاہر کیا ہے،باطن کیا ہے،سوز و مستی کیا ہے،سُرورِ جاوداں کیا ہے،رحیلِ کارواں کیا ہے''لا'' کیا ہے،''اِلٰہ'' کیا ہے،غرضیکہ یہ سب کچھ کیا ہے،کیوں ہے،کب سے ہے،کب تک ہے۔نور وظلمات کیا ہیں۔غیاب وحضور کیا ہیں؟اسی تلاش و تجسس کے دوران اقبال کو اپنے فکر کی عمیق گہرائیوں میں آخر ایک روشن نقطہ دکھائی دیا۔اور اس نقطے نے نکتہ کھول دیا،عقدہ کشائی کردی،اقبال کو اشیا واعمال کی پہچان عطا ہوئی۔یہ نقطہ اُسے حقیقت آشنا کرگیا۔اُسے کائنات کی علامتیں نظر آئیں،شاہیں کا مفہوم سمجھ آیا،کرگس کے معنی سمجھ آئے،صحبتِ زاغ کی خرابی سمجھ آئی۔اِسی روشن نقطے نے اسے اشیا کے باطن سے تعارف کرایا،رموزِ مرگ وحیات عطا کیے۔اس نے گردشِ شام وسحر کا مقصد اِسی نقطے کی روشنی میں دریافت کیا۔یہ نقطہ پھیلتا تو کائنات بن جاتا اور سمٹتا تو آنکھ کا تل بلکہ اقبال کا دل بن جاتا۔ اسی روشن نقطے کو اقبال نے خودی کہا ہے۔

نقطۂ نوری کہ نام او خودی است
زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است[۲]

چونکہ یہ روشن نقطہ ہر چیز بھی ہے،ہر شے سے الگ بھی ہے،اس لیے اس کی تعریف مشکل ہے۔خودی کیا ہے،ہر شے کی اصل ہے۔یہ identity ہے یعنی اس شے کی بنیادی فطری قدر،جس سے اس شے کا قیام ممکن ہے اور جس کے بغیر وہ شے قائم نہیں رہ سکتی۔یہ انفرادیت ہے جو اس شے کو دوسری اشیا سے علاحدہ کرتی ہے،ممتاز کرتی ہے،discriminate کرتی ہے۔یہ وہ تشخص ہے جس سے اس ذات کی بقا ممکن ہے۔یہی وہ راز ہے جو کسی شے کے زندہ رہنے کا واحد جواز ہے۔اگر یہ نہ ہو تو وہ بھی نہیں۔درحقیقت خودی ہر قابلِ ذکر وجود کے باطن کی نورانی کلید ہے۔خودی جذبۂ اظہارِ حُسنِ باطن ہے۔

وجود کیا ہے، فقط جوہرِ خودی کی نمود
کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا[۳]

خودی جوہرِ ذاتی ہے۔اگر یہ نہ ہو تو کسی ذات کے ہونے اور نہ ہونے کا فرق مٹ جائے۔خودی ہر وجود میں موجود ہے اور اس کا اپنا علاحدہ وجود نہیں۔زندگی کی طرح جو، ہر ذی جان میں ہے اور خود میں

نہیں ۔حُسن کی طرح جو، ہر حسین میں ہے اور اُس کا اپنا الگ ٹھوس، قابلِ محسوس وجود نہیں ۔اس لیے خودی کو ایک علاحدہ مضمون کے طور پر سمجھنا ممکن ہی نہیں ۔خودی کے بیان میں paradox کا ہونا فطری ہے اور خودی کا paradox یا تضاد، تضاد نہیں ۔کیونکہ خودی فرد بھی ہے اور معاشرہ بھی، خودی تلوار بھی ہے اور تلوار کی دھار بھی، خودی مستیِ لا یحزنون بھی اور سوز دروں بھی، خودی ضبطِ نفس کا سرمایہ بھی ہے اور اطاعت کی عظیم دولت بھی، خودی تقدیر بھی ہے اور کاسبِ تقدیر بھی، خودی نیابتِ الٰہی کا مقام بھی ہے اور اپنی انفرادیت بھی، یہ جلوت بھی اور خلوت بھی، خودی موجِ آبِ رواں بھی اور ضبطِ فغاں بھی، خودی قریبِ رگِ جاں بھی ہے اور دُوریِ شبِ ہجراں بھی، خودی راز بھی ہے اور محرمِ راز بھی، ناز بھی ہے نیاز بھی بلکہ بے نیاز بھی۔

اقبال نے خودی کو اتنی وسعت عطا کردی ہے کہ اس کو کسی ایک حوالے سے سمجھنا مشکل ہے ۔قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اسے confuse کیا جا رہا ہے لیکن ایسا نہیں ہے ۔اقبال بہر حال اقبال ہے ۔وہ فقیر ہے، عارفِ حق ہے، مفکرِ فکرِ صالح ہے، ملّتِ اسلامیہ کا ایک غیور فرزند ہے، پیر رومی کا مرید باوقار ہے ۔فلسفۂ شرق وغرب سے آشنا ہونے والا اقبال خودی کے تصور سے جو پیغام دے رہا ہے وہ ایک عظیم پیغام ہے ۔اقبال خودی کے بحرِ بے پایاں سے افکار کے گوہرِ تابدار نکالتا ہے اور قاری کے دل و دماغ کو دولتِ لازوال سے مالا مال کردیتا ہے ۔اقبال کی خودی کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان صاحبِ ادراک ہو، صاحبِ نظر ہو ۔اقبال نے یہ شرط عائد کردی ہے کہ:

نظر نہیں تو مرے حلقۂ سخن میں نہ بیٹھ
کہ نکتہ ہائے خودی ہیں مثالِ تیغِ اصیل[۴]

اقبال کا تصورِ خودی عارفوں کے لیے ہے، اہلِ نظر کے لیے ہے، شب بیداروں کے لیے ہے، آہِ سحر گاہی سے آشنا روحوں کے لیے ہے، دل والوں کے لیے ہے، عشق والوں کے لیے ہے ۔یہ وہ علم ہے جو اہلِ علم کے لیے نہیں بلکہ اہلِ نظر کے لیے ہے ۔اقبال کہتا ہے کہ:

اقبال! یہاں نام نہ لے علمِ خودی کا
موزوں نہیں مکتب کے لیے ایسے مقالات[۵]

خودی کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم ان عنوانات کو دیکھیں جن کے ماتحت اقبال نے خودی کو بیان کیا ۔مثلاً کائنات کی خودی ... اسلام کی خودی ... ملّتِ اسلامیہ کی خودی ... عشق و عزم کی خودی ... عمل

کی خودی... فقر کی خودی... آزادی وحریت کی خودی، رفتارِ زمانہ کی خودی اور سب سے اہم خودی، خود آگہی کی خودی۔

وقت اجازت نہیں دیتا کہ ہم ان عنوانات کا خودی کے حوالے سے مکمل جائزہ لیں، بہر حال ایک طائرانہ نظر ہی سہی۔ کائنات خودی کی عظیم جلوہ گاہ ہے۔ اس کی بیداری اور پائیداری خودی کے دم سے ہے۔

خودی کیا ہے، رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے، بیداریِ کائنات[۶]
یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار[۷]
آسماں میں راہ کرتی ہے خودی
صیدِ مہر و ماہ کرتی ہے خودی[۸]

اقبال کا مقصد یہ ہے کہ خودی کائنات کے جلووں میں جلوہ گر ہے۔ جو انسان کائنات کے جلووں سے لطف اندوز نہیں ہوتا وہ ان جلووں میں خودی کی کارفرمائی کیسے دیکھ سکتا ہے؟ اقبال کہتا ہے کہ:

خودی جلوۂ بدمست و خلوت پسند
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند
اَزل اس کے پیچھے، ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے، نہ حد سامنے
سفر اس کا انجام و آغاز ہے
یہی اس کی تقویم کا راز ہے[۹]

یہ کائنات ہے جو ہمیشہ سے آ رہی ہے اور شاید ہمیشہ رہے گی۔ اس کی خودی گردش واستحکام میں ہے۔

اب آیئے اسلام کے آیئنے میں خودی کی جلوہ گری دیکھیں۔ اقبال کے نزدیک اسلام ہی محافظ خودی ہے اور خودی محافظِ مسلماں ہے۔ اقبال اسلام کو بقائے عالم کا ذریعہ سمجھتا ہے، وہ خالی rituals کا قائل نہیں۔

یہ ذکرِ نیم شبی، یہ مراقبے، یہ سُرور
تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں[۱۰]

اقبال بآوازِ بلند کہتا ہے کہ:

خودی کا سِرِ نہاں لا الہ الا اللہ
خودی ہے تیغ، فساں لا الہ الا اللہ[11]

خودی سے اِس طلسمِ رنگ و بُو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید تھی جس کو نہ تُو سمجھا نہ میں سمجھا[12]

حکیمی، نامسلمانی خودی کی
کلیمی، رمزِ پنہانی خودی کی[13]

اقبال خودی کو غلامی سے نجات کا ذریعہ سمجھتا ہے۔خودی کے دم سے مسلمانوں کو اپنی عظمتِ رفتہ حاصل ہوسکتی ہے۔اقبال کے ہاں خودی king maker بلکہ kingdom maker ہے۔

تجھے گُر فقر و شاہی کا بتا دوں
غریبی میں نگہبانی خودی کی![14]

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی[15]

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی
نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہِ فقیر[16]

آئیے اب سب سے آخری لیکن سب سے اہم عنوان،خودی اور خودآگہی کی طرف۔اقبال اپنے قاری کو دعوتِ خودشناسی دیتا ہے۔اس کا پیغام یہی ہے کہ:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی[17]

اپنی پہچان سے ہی اللہ کی پہچان کی طرف قدم اٹھ سکتے ہیں۔اقبال خودی کو ہی پہچان کا ذریعہ مانتا ہے۔اقبال انسان کو پیغام دیتا ہے کہ وہ خود رازِ فطرت ہے۔انسان ہی مقصد و مدعائے تخلیق ہے۔انسان کو اپنا مقام پہچاننا چاہیے۔انسان بالعموم اور مسلمان بالخصوص شاہکارِ فطرت اور اس کا تشخص خودی کے دم سے ہے

جو رہی خودی تو شاہی، نہ رہی تو رُوسیاہی[18]

اسی طرح جو قوم محرومِ خودی ہو اس سے اقبال یوں مخاطب ہے:

اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے
قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف[۱۹]

اقبال معاشی اور سیاسی غلامی میں گرے ہوئے انسان کو بلندیوں کی طرف پکارتا ہے۔ وہ اسے مایوسی کے اندھیروں سے نکال کر امید کی روشن راہوں پر گامزن کرنا چاہتا ہے۔

تو رازِ کُن فکاں ہے، اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا[۲۰]

تُو اپنی خودی کو کھو چکا ہے
کھوئی ہوئی شے کی جستجو کر[۲۱]

غافل نہ ہو خودی سے، کر اپنی پاسبانی
شاید کسی حرم کا تُو بھی ہے آستانہ[۲۲]

مسلمانوں کو ان کی خودی سے آشنا کر کے اقبال ان کو پیغام دیتا ہے کہ:

ہوئی جس کی خودی پہلے نمودار
وہی مہدی، وہی آخر زمانی![۲۳]

خودی کے ساز میں ہے عمرِ جاوداں کا سراغ
خودی کے سوز سے روشن ہیں امتوں کے چراغ[۲۴]

اقبال کے ہاں خودی کی بلندی ہی مقصدِ حیات ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کا ارادہ تقدیر بن جاتا ہے:

خودی شیرِ مولا، جہاں اس کا صید
زمیں اس کی صید، آسماں اس کا صید[۲۵]

اقبال خودی کی نگہبانی کا درس دیتا ہے۔ خودداری کا پیغام دیتا ہے۔ اقبال کی خودی، زندگی ہے، حیاتِ جاوداں ہے۔ یہ ملّتِ اسلامیہ کے لیے ایک عظیم ذریعۂ حصولِ قوت ہے۔ خدا ہمیں خودی کے اس بلند مقام سے آگاہ فرمائے جہاں:

خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے[۲۶]

نوٹ: یہ مقالہ علامہ محمد اقبال کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر ۱۹۷۷ء میں گورنمنٹ کالج سیٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی میں منعقد ایک تقریب میں پیش کیا گیا۔

حوالہ جات

* مرحوم صوفی دانشور (۱۵ جنوری ۱۹۲۹ء—۱۸ جنوری ۱۹۹۳ء)۔

۱۔ اصغر حسین اصغر گونڈوی، سرودِ زندگی مشمولہ کلیاتِ اصغر (لاہور: مکتبہ شعر و ادب، فروری ۱۹۷۹ء)، ص ۷۸۔

۲۔ محمد اقبال، اسرارِ خودی مشمولہ اسرار و رموز (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، ۱۹۷۲ء)، ص ۱۸۔

۳۔ محمد اقبال، ضربِ کلیم مشمولہ کلیاتِ اقبال اردو (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۰ء)، ص ۵۴۶۔

۴۔ محمد اقبال، بالِ جبریل، ص ۳۹۱۔

۵۔ محمد اقبال، ضربِ کلیم، ص ۵۹۱۔

۶۔ محمد اقبال، بالِ جبریل، ص ۴۵۵۔

۷۔ ایضاً، ص ۴۵۷۔

۸۔ ایضاً، ص ۴۶۹۔

۹۔ ایضاً، ص ۴۵۵—۴۵۶۔

۱۰۔ محمد اقبال، ضربِ کلیم، ص ۵۱۷۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۵۲۷۔

۱۲۔ محمد اقبال، بالِ جبریل، ص ۳۵۹۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۴۱۲۔

۱۴۔ ایضاً۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۳۷۷۔

۱۶۔ محمد اقبال، ضربِ کلیم، ص ۵۸۹۔

۱۷۔ محمد اقبال، بالِ جبریل، ص ۳۶۷۔

۱۸۔ ایضاً، ص ۳۷۷۔

۱۹۔ محمد اقبال، ضربِ کلیم، ص ۵۹۹۔

۲۰۔ محمد اقبال، بانگِ درا، ص ۳۰۲۔

۲۱۔ محمد اقبال، بالِ جبریل، ص ۳۸۷۔

۲۲۔ ایضاً، ص ۳۸۲۔

۲۳۔ ایضاً، ص ۴۱۲۔

۲۴۔ ایضاً، ص ۴۲۳۔

۲۵۔ ایضاً، ص ۴۵۷۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۳۸۲۔

مآخذ

اقبال، محمد۔اسرار و رموز۔لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، ۱۹۷۲ء۔

_____۔کلیات اقبال اردو۔لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۰ء۔

کوہڑوی، اصغر حسین اصغرؔ۔کلیات اصغر۔لاہور: مکتبۂ شعر و ادب، فروری ۱۹۷۹ء۔